پہلی بارش

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ناصر کاظمی

پہلی بارش

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ترتیب

نمبر شمار		صفحہ نمبر
(i)	عرضِ سُخن (دیباچہ طبع اوّل) ______ غالب احمد	۴
(ii)	دیباچہ طبعِ سوم ________ باصر سُلطان کاظمی	۸

غزلیں

۱۔	میں نے جب لکھنا سیکھا تھا	۲۸
۲۔	تُو جب میرے گھر آیا تھا	۲۹
۳۔	میں جب تیرے گھر پہنچا تھا	۳۰
۴۔	شام کا شیشہ کانپ رہا تھا	۳۲
۵۔	دِن کا پھول ابھی جاگا تھا	۳۳
۶۔	پتّھر کا شہر وہ بھی کیا تھا	۳۵
۷۔	پچھلے پہر کا سنّاٹا تھا	۳۶
۸۔	گرد نے خیمہ تھام لیا تھا	۳۸
۹۔	مجھ کو اور کہیں جانا تھا	۳۹
۱۰۔	تُو جب دوبارہ آیا تھا	۴۰
۱۱۔	تُجھ بِن گھر کتنا سونا تھا	۴۲
۱۲۔	دھوپ تھی اور بادل چھایا تھا	۴۴
۱۳۔	دم ہونٹوں پر آ کے رُکا تھا	۴۵
۱۴۔	چاند ابھی تھک کر سویا تھا	۴۷
۱۵۔	نئے دیس کا رنگ نیا تھا	۴۸
۱۶۔	چھوٹی رات، سفر لمبا تھا	۴۹

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

۱۷۔	تھوڑی دیر کو جی بہلا تھا	۵۱
۱۸۔	مَیں ترے شہر سے پھر گزرا تھا	۵۳
۱۹۔	میں اس شہر میں کیوں آیا تھا	۵۴
۲۰۔	پَل پَل کانٹا سا چُبھتا تھا	۵۵
۲۱۔	روتے روتے کون ہنسا تھا	۵۷
۲۲۔	پَون ہری، جنگل بھی ہرا تھا	۵۸
۲۳۔	تنہائی کا دُکھ گہرا تھا	۵۹
۲۴۔	تیرا قصور نہیں، میرا تھا	۶۰

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

عرضِ سُخن

(دیباچہ طبعِ اوّل)

اردو زبان ایک استعارہ ہے جسے ہر دور کے ادیبوں کو از سرِ نو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ زبان، اپنے ماحول کے وجود اور وجدان کے ملاپ سے منفقۂ شہود پر آتی ہے۔ جب تک وجود اور وجدان دونوں کی دہلیز پر کوئی، موجود، نہ ہو، زبان، یا کلام ممکن نہیں غیر موجودگی وجود میں وجد کی کیفیت پیدا نہیں کر سکتی۔ وجودیت کی قید میں مبتلا کر سکتی ہے جب کوئی، موجود، نہ ہو، ہم اپنے وجود کی اذّیت تو محسوس کر سکتے ہیں لیکن زندگی کی رواں دواں حرکت ممکن ، اس وقت خون اچھلنا بند کر دیتا ہے۔ سورج کے آنے اور جانے کی گرمی اور شفق رنگی نہیں رہتی۔

اس خطّۂ زمین میں انسانی زندگی نے پچھلی تین صدیوں میں اپنے جسم اور روح کے وصال کے لیے اردو زبان کو وجود دیا۔ اپنے ماضی، حال اور مستقبل اس وجود سے منسلک کیے، روایات تجربہ اور کشف اس میں شامل کیے اور اسے اپنی آرزوئے حیات کا ایک وسیلہ بنایا۔ اس خطّۂ زمین کی انسانی زندگی اس اعتماد سے اُبھری کہ وہ حواس کی جنّت سے نکل کر آفاق کی وسعتوں کی طرف روانہ ہوگی لیکن حال کی دہلیز پر ہم وجودیت کی قید میں جکڑے گئے اور حقیقت سے دُور جا پڑے۔

حقیقت کے سوا اور کون موجود ہے؟ حُسن، اظہارِ حقیقت کا وجود ہے اور عشق اظہارِ حقیقت کا وجدان دونوں کا وصال زمان و مکاں کے ہر ذرّے میں موجزن ہے اور تمام انفس و آفاق کی حدود میں حرکت اور زندگی کا موجب ہے "میں" اور "تُو" اِسی رشتے کے دو پیکر ہیں۔ دو ایسے سائے، جو وصال و فراق کی دھوپ چھاؤں میں گھٹتے بڑھتے، ملتے ملاتے اور پھلتے پُھولتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا لباس ہیں، ایک دوسرے کو اوڑھ کر ایک دوسرے کے لبادوں میں ملبوس وحال، کے لمحے کی دہلیز سے گزر کر اپنے مستقبل کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے ماضی کی وادیوں میں اترتے جاتے ہیں۔ حل کا لمحہ تو شعور کی ایک ایسی جھلک ہے، جس میں حقیقت اپنی چھب دکھلا کر ہمیں مستقبل کی آرزو میں ماضی کے قدیم خزینوں کی طرف لے جاتی ہے اور شعور کی ایسی منفرد اور ٹھری ہوئی ساکت جھلکیوں کا ایک سلسلہ لمحوں میں کچھ ایسا پرد یا ہوا ہمارے سامنے ہوتا ہے کہ ہم گزر رہے ہوتے ہیں اور حرکت ہمیں ان لمحوں میں پردئی ہوئی کڑی میں نظر آتی ہے۔ یہ لمحے، شعور کی اس جھلک پر لفظوں کے موتی ایجاد کرتے ہیں اور یہ لفظوں کے موتی ہم کو ماضی خزینوں کی طرف لے جاتے ہیں اور اس طرح ہماری زندگی کا یہ سفر، ہر لمحہ، ہر لحظہ جاری رہتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل شعور کے مختلف علاقے ہیں، جہاں مختلف زمانوں، زمینوں اور زبانوں میں انسانی زندگی کے سفر کی داستان کئی فصلوں کی صورت میں بار بار بوئی جاتی ہے اور بار بار کاٹی جاتی ہے۔

ایک عرصے تک کچھ اسی طرح، اس خطّۂ زمین پر، جسے سرزمین پاک و ہنداب کہا جاتا ہے انسانی شعور نے من و تو کے وصال سے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

لفظوں کے نئے موتی ایجاد کیے۔ فہم وادراک کے نئے اور پرانے خزینے دریافت کیے اور انسانی زندگی کی جیتی جاگتی آواز اور انسانی فہم و ادراک کی بولتی ہوئی زبانِ "اُردو" اس خِطّہ کے افق پر نمودار ہوئی۔

شاعری جذبے اور تخیّل سے جنم لیتی ہے۔ جذبات اور تخیّلات کے لیے ماحول کی چار دیواری کا ہونا لازمی ہے۔ اس لیے کسی معاشرتی ماحول کی چار دیواری کے بغیر کسی زبان کی شاعری کا پرورش پانا ممکن نہیں۔ ماحول کے رنگ و بُو سے آزاد رہ کر کوئی جذبہ یا تخیّل دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ جذبے کی قوّت وتوانائی اور تخیّل کی خوبصورتی اور دلکشی کا انحصار معاشرتی ماحول کی پائیداری اور اس ماحول کے مخصوص حالات کی سازگاری ہے۔

اردو زبان کی جس معاشرتی ماحول میں پرورش ہوئی ہے، اس کی پچھلے دوسو برس کی تاریخ ہمیں یہ بات مان لینے پر مجبور کرتی ہے کہ ہماری اجتماعی روایات اور اختیارات میں اس قدر تیزی کے ساتھ پے در پے تبدیلیاں آتی چلی گئیں ہیں کہ ماحول معاشرتی اعتبار سے بہت حد تک ناپائیدار، بے اصل اور غیر یقینی نظر آتا رہا ہے اور بار بار ہمارے جذبات اور تخیّل کے روایتی اور تاریخی رشتے ٹوٹ ٹوٹ کر بنتے بگڑتے رہے ہیں۔ افراتفری کا یہ تمام عہد خصوصاً عذر کے بعد کا زمانہ اور تقسیم پاک و ہند کا دور اور شاعری کے لیے آزمائش اور ابتلا کی سنگین ترین گھڑیاں تھیں۔ ہمارے جذبات اور تخیّل کے وصال کے لیے نہ تو ماحول کی پرانی حویلی رہی اور نہ نیا گھر ہی بنا۔ پرانی حولی کے نقوش بھی باقی ہیں اور نئے گھر کا اُدھورا سا نقشہ بھی سامنے ہے۔ اس حال میں شاعر کو اپنی ذات کے علاوہ درحقیقت کسی اور چیز کی حقیقی ہونے پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس لیے جذبات اور تخیّل پر داخلی رجحانات کا غلبہ ایک لازمی امر تھا۔ ہمارے جذبات کا اظہار بھی داخلی تھا اور ہمارے تخیّل کی پرواز بھی داخلی تھی۔

اردو شاعری کے "عشقِ" اور "حُسن" کا قِصّہ دونوں دروں بنی کے آئینہ دار رہے ہے۔ اس کے طفیل عشق دماغ کا خلل قرار دیا گیا اور حُسن کو نظر کا دھوکہ سمجھا گیا، یعنی نہ ہمیں اپنے جذبات حقیقی نظر آئے اور نہ ہی ہمیں اپنے تخیّل میں اُچھلتی کودتی رواں دواں زندگی کی حرارت محسوس ہوئی اور اس طرح آہستہ آہستہ شاعر اور اس کی شاعری زندگی کے بہتے ہوئے دھارے سے دور ہوتے گئے جس شاعر نے شاعری کی مخصوص روایت پر اکتفا کی، وہ "حُسن وعشق" کا داستان گو یا "ادب برائے ادب" کا بیمار ٹھہرا اور جس نے زندگی کے قریب آنے کی جرئات کی وہ فلسفی یا ولی اللہ قرار دیا یا سیاستداں اور زمانہ ساز لیکن اس تمام دور میں اِن دونوں قسم کے شاعروں کے جذبات اور تخیّل کا رجحاں داخلی زیادہ اور خارجی کم تھا۔

یہاں کسی حد تک کچھ تفصیل کے ساتھ انسانی زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جذبات ہمارے اندر کی دنیا کو خواہش اور طلب کے زور پر باہر کی دنیا سے آشنا کرتے ہیں اور تخیل باہر کی دنیا کو ہمارے حواس کے رستوں سے ہماری باطنی دنیا سے ملاتا ہے باطن کی دنیا اور ظاہر کی دنیا مل جُل کر ہماری زندگی میں عقل اور روح کی وحدت کو قائم رکھتے ہیں اور اس وحدت کو قائم رکھنے کے لیے ایک ایسے معاشیاتی ماحول کا ہونا ناگزیر ہے جس میں انسانوں کا ایک ملّی یا سماجی گروہ اپنی باطنی دنیا اور ظاہری دنیا کا وصال پا سکے۔ جذبات جہاں عشق اور محبت کے روپ میں اپنے ازلی اور ابدی ساتھی کے آغوش میں حُسن اور سچائی سے ہم کنار ہوسکیں، جہاں باطن اور ظاہر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دونوں میں قربت کا احساس پیدا ہو سکے۔

کسی حد تک جدید اردو شاعر کا اور بہت حد تک جدید تر اردو شاعر کا حال آسٹرین ناولسٹ کافکا ایسا ہے۔ اس نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا: "میں اپنی ذات کے علاوہ باقی تمام اشیاء سے ایک خلا کے درمیان میں آ جانے کی وجہ سے منقطع ہو گیا ہوں۔ اب مجھے ہر چیز نظر کا دھوکا دکھائی دیتا ہے۔ کنبہ، دفتر، گلی کُوچے، عورت، سب دھوکے ہیں، جو کبھی کبھی پاس آتے ہیں اور پھر دُور ہو جاتے ہیں۔ پس سچائی ہے یہ کہ میں اپنے سر کو ایک ایسی دیوار سے پھوڑ رہا ہوں جس میں نہ کوئی دروازہ ہے، نہ کھڑکی" ــــــ یہ دیوار جدید اردو شاعر کے اپنے وجود کی دیوار ہے۔ جس سے وہ پچھلے کئی سالوں سے اپنا سر پھوڑ رہا ہے اور اس دیوار میں نہ کوئی در ہے نہ کوئی روزن، اور اگر ہیں بھی تو وہ بند کر دیئے گئے ہیں تاکہ جذبے اور تخیل کی اس فطری آرزو کا گلا گھونٹا جا سکے کہ وہ ہر دم کسی ماحول میں بسنے اور رچنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں۔ جدید شاعر کے لیے جذبے اور تخیل کا یہ عمل اس کی اپنی ذات کے لیے غیر ضروری ہے کسی معاشرتی ماحول سے کسی وابستگی کے بغیر اسے یہ خواہش کیونکر ہو کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل کو ان کے تمام لوازمات کے ساتھ اپنے وجود میں اپنے وجدان میں زندہ رکھ سکے اور عشق اور حسن کے وصال کے رشتوں کو جذبے اور تخیل کے مناسب امتزاج سے قائم کر سکے اور زندگی کی پُرانی قدروں کو نئی اقدار سے آن ملائے اور زندہ رہنے کی خواہش کو مرنے نہ دے بلکہ اسے نئی آس اور نئی پیاس سے ہم آہنگ کرے اور نئی دنیا کے متلاشیوں کے لیے امید کا پیغام اپنی شاعری کی ہری بھری شاخ سے لا کر دے۔۔

حُسن کی رعنائی اور سچائی کی توانائی محسوس کرنے کے لیے شاعر کو اپنی ذات کی انائیت اور انفرادیت سے بہت حد تک دستبردار ہونا پڑتا ہے اور قلب صافی کو پہلو میں لیے کسی معاشرے کے ماضی، حال اور مستقبل کی وادیوں میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ حقیقی شاعر معاشرے سے کبھی ناامید اور بد دل نہیں ہوتا، اُمید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ وہ معاشرے کی ذلتوں کو برداشت کرتا ہے۔ حال کے طمانچوں کو بہتا ہے لیکن اس کی آنکھ حُسن اور سچائی کے تمام مناظر کو ماضی، حال اور مستقبل کے پس منظر میں دیکھنے اور سمونے کی قوّت رکھتی ہے اور وہ اپنے باطن سے تمام حسین اور سچّے جذبوں کو باہر کی حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے اور شاعری کا نغمہ ہمیشہ اس دوہری حقیقت کے مضراب سے پُھوٹتا ہے اور اس دوہری حقیقت کا مضراب شاعر کا دل ہوتا ہے۔ اس عبوری دور میں اردو شاعری دل کی اس ماہیت سے محروم رہی ہے۔

تنہا شعور اور کورا کاغذ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں کورے کاغذ کی کُلفت کی داستان بہت بہت طویل ہے۔ شعور کی زمین جب پانی کو ترسی ہے۔ اور اس کی اپنی کوکھ سے پانی کے تمام خزانے خشکی کی نذر ہو جاتے ہیں تو شعور کورے کاغذ کی سطح پر ماہئی بے آب کی طرح تڑپتا ہے خشک مٹی کی بو باس اور اس کے تمام رنگ اور زنگ ایک زہر کی طرح اس کے ریشے ریشے میں سرایت کرنے لگتے ہیں۔ لاشعور کی بھیانک گزری ہوئی راتیں، بیاباں دن اور ان کی تمام صعوبتیں اس کے چشمۂ حیات کی پر جمی ہوئی کائی کی اشکال میں اور ڈراؤنے خوابوں کی صورت بگڑتے بنتے ہرتے ہیں۔ شعور کی اصل زبان وہ الفاظ ہیں جو شاعری کے خطّے میں آباد ہوتے ہیں۔ شاعر اور شعور ان کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے۔ ماضی کے گرد و غبار اور مستقبل کی دُھند اور کہرے اس کا سامنا ہوتا ہے۔ جذبہ، خیال، اور تصوّر، ایک طرف۔ ہوا،

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

چاندنی اور دھوپ دوسرے طرف۔ آفاق کی وسعتیں مستقبل بن کر نفس اور زمین کی تاریکیاں اور اس کی کلفتیں ماضی کا روپ دھار کر شاعر اور شعور کے سامنے کبھی ڈھکی چھپی اور کبھی ننگی حقیقتیں بن کر آ کھڑی ہوتی ہیں وہ زندگی کے ان جامد اور لامتناہی سلسلوں سے گزرتا ہے۔ ایسی الجھن میں کبھی وہ ماضی کی طرف لوٹتا ہے اور روایات کو آواز دیتا ہے۔ زمین اور شعور کی گہرائیوں میں دفن کی ہوئی خوشیوں اور اداسیوں کو لفظوں میں پرِدتا ہے اور کبھی مستقبل کے دُھندلے نقوش سے ہوا کے رُخ پر اپنے آپ کو انجانے بادلوں کے قافلوں کے سپرد کر دتا ہے۔ ماضی کے قافلوں کے گرد و غبار اور مستقبل کے دُھندلے نقوش اور بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک کی سوا جب اسے کچھ اور نظر آتا تو پھر وہ ہوا، چاندنی، دھوپ، جذبہ، خیال اور تصوّر اور اپنے وجود اور اپنے وجدان کو ساتھ لے کر، تُو، کو پکارتا ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے کہ، تو، کے سوا اور کوئی موجود نہیں۔ اس کے جسم دروح کا ذرّہ ذرّہ جب، تُو، کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک خلقِ جدید محسوس کرتا ہے اور اس کا کلام اور اس کا بیان، جدید، کی حدوں کو چُھوتا ہے۔ وہ جدید، جس میں جدّت اور تجوید، وجود اور وجدان، حُسن اور عشق، میں اور، تُو، کا وصال ہوتا ہے۔

ناصر کاظمی من وتو کے اسی وصال کا شاعر ہے۔ اردو شاعری حُسن وشعق، من وتو اور وجود و وجدن کے جس بُعد کا شکار رہی، ناصر نے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بُعد کی اس خلیج کو پاٹ دیا ہے، پہلی بارش میں غزل اور نظم کا امتیاز اٹھ گیا ہے۔ میں، اور، تُو، کا وصال ہو گیا ہے۔ جدّت اور تجدید ہم آغوش نظر آتے ہیں اور روایت اور وجدان کے امتزاج نے زبان کے شعور کے مختلف علاقوں کو ایک کر دیا ہے۔

غزل روایت کی طرف جُھکتی ہے، ماضی کو آواز دیتی ہے، اسے فارسی اور عربی کی خوچہ چینی پر مباہات وافتخار رہا ہے اور نظم میں جدید دور کا اضطراب ہے۔ ناصؔر نے ان غزلوں میں جذبات اور تخیل میں سناکحت کا جو رشتہ استوار کیا ہے، اس سے دونوں کی اصل واضح بھی ہے اور غیر موجود بھی۔ اور یہ اس طرح ممکن ہوا کہ ناصؔر کسی بے روزن و دَر، دیوار سے اپنا سر نہیں پھوڑ رہا ہے، اس نے نفس کی انا کے خلا کو اپنے اور ماسوا کے درمیان سے دور کر لیا ہے۔ اس کو کوئی چیز دھوکا نہیں دیتی، وہ ہر چیز کو اپنی اصل میں دیکھتا ہے۔ اپنے نفس کی انا کو چھوڑ کر وہ سپرد گی کے جس عالم میں ہے اس میں جذبات وتخیل کا بُعد مفقود اور من وتو کا امتیاز معدوم ہے۔ اسی عالمِ سپردگی میں شاعر، جدید، کی حدوں کو چُھوتا ہے۔ اس کے لیے وہ لمحہ پہلی بارش کے نزول کا لمحہ ہوتا ہے۔ اسے اس بارش کے ہر قطرے میں نامعلوم سے معلوم اور پھر معلوم سے نامعلوم تک کا سفر ہزار رنگوں اور ہزار داستانوں میں نظر آتا ہے۔ ناصر کاظمی کی یہ شاعری اردو کی پہلی بارش ہے اور ناصر کاظمی بزن اردو بارش کا پہلا قطرہ۔

غالب احمد

لاہور۔ یکم مارچ ۱۹۷۵ء

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دیباچہ طبعِ سوئم

(۱)

میں سکول میں پڑھتا تھا۔ نیا نیا شعر کہنا شروع کیا تھا۔ ایک محبوب مشغلہ پاپا کی غیر موجودگی میں ان کے کمرے میں، ہر قسم کے نئے اور پرانے رسالے، کھنگالنا، تھا۔ (غیر نصابی کتابیں پڑھنے کا دورا بھی نہیں آیا تھا) ایک روز، نیا دور، کے دو مختلف شماروں میں پاپا کی کئی غزلیں ایک ساتھ ملیں۔ ان کے بارے میں انوکھی بات یہ تھی کہ یہ سب کی سب ایک ہی زمین میں تھیں۔ حیرت ہوئی کہ پاپا، جو ایک غزل میں ایک ہی قافیہ ایک سے زائد بار باندھنے سے گریز کرنے کو کہا کرتے تھے، خود ایک ہی زمین میں اتنی غزلیں لکھ گئے، اور کئی قافیے کئی کئی دفعہ استعمال کیے۔ اچھنبے کی دوسری بات یہ تھی کہ ان کی غزلوں کی زبان اتنی سادہ تھی کہ پہاڑ اور گلہری، اور گائے، بکری، کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور لب و لہجہ روزمرہ گفتگو کے اتنا قریب تھا کہ لگتا جیسے نثر کو اوزان کا پابند کر دیا گیا ہو۔ شعر کہنا بہت آسان دکھائی دینے لگا، کئی بار تو بے اختیار ہنسی بھی آ گئی اوزان کا پابند کر دیا گیا ہو۔ شعر کہنا بہت آسان دکھائی دینے لگا، کئی بار تو بے اختیار ہنسی بھی آ گئی

سینے پر دو کالی کلیاں
پیٹ کی جھیل میں کنول کھلا تھا

پاپا ریڈیو سٹیشن سے لوٹے تو میں نے انہیں دیکھتے ہی کہا، "پاپا! کچھ غزلیں پڑھیں آج۔ اوپر آپ کا نام تھا۔ آپ ہی کی ہیں؟"

ہاں ہاں میری ہیں، بالکل میری___ کیوں؟ پاپا نے رسالے دیکھتے ہوئے کہا اور سنجیدہ پا کر انہیں تشویش ہونا شروع ہوئی کہ کل تک تو برخوردار بھلا چنگا تھا۔

بہت سیدھی سیدھی غزلیں ہیں___ پھیکی پھیکی___ کچھ زیادہ ہی آسان اور سادہ" میں نے ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا۔ " کوئی بھی لکھ سکتا ہے..... بات نہیں بنی۔"

اب سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں کہ ناصر کاظمی سے یہ بات اور وہ بھی پہلی بارش کے بارے میں، اس انداز سے____ میں نے کہہ دی؟! پھر اپنی جہالت کو معصومیت کا نام دے کر دل کو تسلّی دیتا ہوں۔ نابالغ، نماز روزے کے علاوہ بھی بہت سی پابندیوں سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے حدود میں رہنا ناممکن ہوتا ہے کیونکہ وہ حدود سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ جہاں تک بیبا کی کا تعلق ہے تو ناواقفیت بھی اس کا تناہی اہم منبع ہے جتنا کہ علم۔ (اگرچہ جو جرأت لاعلمی سے پھوٹے وہ گستاخی اور ہٹ دھری کہلاتی ہے اور جو علم کے نتیجے میں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پیدا ہو وہ خود اعتمادی اور یقین کی علامت خیال کی جاتی ہے) پھر نابالغوں اور ناواقفوں کو ایک اور رعایت بھی تو حاصل ہے۔ علم کا باب واکرنے کی ایک کلید بیبا کی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جاننے اور سیکھنے میں شرم محسوس نہ کرو۔ پاپا بھی یہی تلقین کیا کرتے تھے۔ سوالوں کے جواب چاہو اور جواب سن کر سوال کرو۔ سوال کتنے ہی مضحکہ خیز اور بچگانہ کیوں نہ ہوں۔

تو ذکر تھا، پہلی بارش کی، کی غزلوں کا سری بات پر پاپا کا ردِعمل ایسا تھا گویا وہ کچھ بتانے یا سمجھانے بلکہ کچھ بھی کہنے کو بے سود سمجھ رہے ہوں۔

مذکورہ واقعے کے کئی برس بعد اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے جب پاپا نے اپنا کلام اکٹھا کر کے ترتیب دینا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ ایک ڈائری کے پہلے صفحے پر، پہلی بارش، جلی حروف میں لکھا ہوا تھا اور اگلے اوراق میں ویسی ہی ہم زمین غزلیں ایک پرانی ڈائری (جو میرے پاس اب بھی محفوظ ہے) سے نقل کر رہے تھے۔ اس پرانی ڈائری میں یہ غزلیں من وعن اسی طرح لکھی ہوئی تھیں جیسے میں رسالے میں پڑھ چکا تھا۔ مگر اب کئی اشعار قلم زد یا تبدیل کیے جا چکے تھے۔ کچھ نئے اشعار کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اور دو تین غزلیں خارج کر دی گئیں تھیں۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ یہ مجموعہ غزلوں کے ان مجموعوں سے بہت مختلف تھا جن سے میری آشنائی تھی۔ میں نے پاپا سے کہا کہ وہ اسے چھپوا کیوں نہیں دیتے تو ان کا جواب صرف اتنا تھا، "ابھی لوگ اس کے لیے تیار نہیں"۔

پاپا اکثر ہم سے، ہماری عمر کے اس دور کے مطابق جس سے ہم گزر رہے ہوتے، سوال کیا کرتے، ہمارا امتحان لیا کرتے، ایک روز رات کو اپنے لکھنے پڑھنے کے اوقات میں مجھے بلایا اور کہا، "اس شعر کے کیا معنی تمہاری سمجھ میں آتے ہیں؟"

دل کی صورت کا اک پتہ تیری ہتھیلی پر رکھا تھا

میں سوچنے لگا۔ پان کا پتہ میرے ذہن میں آ رہا تھا لیکن غزل کے شعر کے معنی ایک پہیلی کے حل کی طرح بتاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

"دل کی صورت کا پتہ نہیں دیکھا کبھی؟"

"پان!" میں نے فوراً جواب دیا۔

"ٹھیک۔ اب شعر کو دیکھو

کاغذ کے دل میں چنگاری
خس کی زباں پر انگارہ تھا

"سگریٹ۔ ماچس۔"

خوب۔ اب یہ شعر

چاند کے دل میں جلتا سورج
سورج کے دل میں کانٹا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

یہ، پہلی، میں نہ بوجھ سکا۔ آخر انہوں نے خود ہی بتایا: "فرائڈ انڈا"۔

بہت محفوظ ہوا۔ "تو کیا پہلیاں ہیں؟"

"ہاں۔ پہلیاں بھی۔" وہ مسکرانے لگے۔

یہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے لیے اہم سے اہم تر ہوتا چلا گیا ہر شے اپنے علاوہ (یعنی جو کچھ وہ دکھائی دیتی ہے یا سمجھی جاتی ہے، اس کے علاوہ) اور بھی بہت کچھ نظر آتی۔ پاپا کا یہ شعر ہر وقت ذہن میں پھرنے لگا

پھول کو پھول کا نشاں جانو
چاند کو چاند سے ادھر دیکھو !

پھر ایک روز دل کی صورت کا پتہ ایک ہتھیلی پر رکھا دیکھا۔ سر بکف لوگوں کے بارے میں تو سنا تھا، دل بدست بھی دیکھ لیا۔ پھر، چاند، کے دل میں جلتا سورج، سورج، کے دل میں کانٹا کاغذی پیکر کے دل میں چنگاری اور خس، کی زباں پر انگارہ بھی دیکھا۔ اب ان اشعار میں پہلیاں کم اور کہانیاں زیادہ نظر آنے لگیں۔ میرے حیرت کے صحرا میں، پہلی بارش، سے نت نئے گل ہائے معانی کھلے جن باتوں پر پہلے ہنسی آئی تھی، اب آنسوؤں کے دریا بہتے۔ میؔر پر پاپا کا مضمون جو کبھی، سویرا، میں شائع ہوا تھا، (اور اب ان کے نثری مجموعے، خشک چشمے کے کنارے میں شائع ہوا ہے) پڑھا۔ اس شعر: "یاں پیٹھن نکل گیا واں غیر / اپنی ٹکی لگائے جاتا ہے" کے حوالے سے پاپا کی خیال آرائی پڑھ کر مجھے اپنا پہلی بار، پہلی بارش، پڑھنا بہت یاد آیا۔ لکھتے ہیں: "بظاہر یہ شعر آدمی کے سستے اور عمودی جذبات کو اس قدر پرانگیختہ کرسکتا ہے کہ معقول قاری بھی ان کی رو میں بہہ کر اس طرح قہقے لگانے لگے کہ اسے اپنے مبتذل ہونے پر کوئی شک نہ رہے، ردِعمل کے طور پر ایسا معقول قاری بالکل ویران ہوسکتا ہے اور انہی ویران لمحوں میں یہ شعر اپنا آپ دکھاتا ہے۔ اس میں بھونڈے قہقوں کی گونج کے ساتھ وہ المناک تجربہ اپنی پوری شدت کے ساتھ سمویا ہوا ہے جس پر دھاڑیں مار مار کر رویا بھی جاسکتا ہے۔"

،پہلی بارش، دوبارہ، سہ بارہ پڑھی۔ یوں لگا جیسے کتاب اب سمجھ میں آگئیں جس طرح کسی غزل کے اشعار اپنا جداگانہ وجود رکھتے ہوئے بھی آپس میں کسی طور پر منسلک ہوتے ہیں اسی طرح، پہلی بارش کی غزلیں بھی انفرادی طور پر مکمل غزلیں ہونے کے ساتھ ساتھ مل کر ایک طرح، پہلی بارش کی غزلیں بھی انفرادی طور پر مکمل غزلیں ہونے کے ساتھ ساتھ مل کر ایک وحدت کو تشکیل دیتی دکھائی دیں۔ یہ وحدت کو تشکیل دیتی دکھائی دیں۔ یہ وحدت طویل نظم کے قریب کی کوئی چیز معلوم دی۔ ہر غزل گویا اس نظم کا ایک بند تھی۔ جس کے اشعار ایسے مرطوط نظر آئے جیسے کسی زینے کے مدارج یا کسی منزل کے مراحل۔ ایسا محسوس ہوا گویا شاعر کوئی کہانی سنا رہا ہو۔ بار بار پڑھنے پر یہ کہانی واضح ہوئی چلی گئی۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

(۲)

صدیوں پرانی روایت ہے کہ شعراء (مغربی ومشرقی) طویل نظم کی ابتدا کدایا دیوی دیوتاؤں (اپنے اپنے ایمان یا اعتقاد کے مطابق) سے خطاب کرکے کرتے ہیں۔، پہلی بارش، اور روایتی طویل نظم کا ایک اور مشترک وصف، آغاز ہے

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

اس شعر کے بارے میں پاپا خود کہا کرتے تھے کہ اس شمار چند بہترین حمدیہ اشعار میں ہوگا۔

اس کے علاوہ پہلی غزل، کہانی، کے، مرکزی کردار، کا تعارف بھی ہے۔ شروع ہی میں پڑھنے والا جان لیتا ہے کہ یہ ایک ایسے تخلیق شخص کی کہانی ہے جو اللہ کو ماننے والا اور اس کی کتاب کا بغور مطالعہ کرنے والا ہے۔ اللہ ہی کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے وہ قرآنی آیات پڑھ کر اوندھے منہ گر نہیں جاتا، اندھا دھند ایمان نہیں لے آتا، بلکہ تدبر کرتا ہے اور غور وفکر کے ذریعے ان آیات کو اپنے رگ وپے کا حصہ بناتا ہے۔ وہ آدم کے مقام اور کائنات میں اس کے کردار۔ سے بخوبی واقف ہے:

میں وہ صبرِ صمیم ہوں جس نے
بارِ امانت سر پہ لیا تھا
میں وہ اسمِ عظیم ہوں جس کو
جن و ملک نے سجدہ کیا تھا

یہ شخص نہ صرف اللہ سے سوال کرنے کی بلکہ شکوہ کرنے کی بھی جرئات رکھتا ہے:

تو نے کیوں میرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا
پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

یہ اشعار غزلوں کے اس سلسلے میں بیان کی جانے والی کہانی کے موضوع کی طرف بھی ایک واضح اشارہ ہیں۔

یہاں اگر میں یہ کہوں کہ پاپا کی اپنی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنے دعوے کی حمایت میں ان ہی کے دو بیانات درج کرتا ہوں؛ سویرا، کے ایک مذاکرے میں، میرا ہمعصر (مطبوعہ) خشک چشمے کے کنارے) کے تحت لکھتے ہیں،"....... میں عصر کے قرآنی معانی پر توجہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اب اگر سلیم احمد صاحب یہ اعتراض کریں کہ میں ادب کے معاملے میں قرآن مجید کو بیچ میں کہیں لاتا ہوں تو میری گزارش ہے کہ میں قرآن کو ادب سمجھ کر پڑھتا ہوں اور اپنی زبان کے بعض لفظوں کے اصل معانی پر اس لیے بھی زور دیتا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہوں کہ دورِ غلامی نے ہماری قومی علامتوں کا اس قدر مذاق اڑایا ہے کہ اب ہم ہر معاملے میں اہلِ مغرب کے دست نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مولوی، مولانا، حضرت، یہ الفاظ مغرب زدہ لوگوں کے لیے محض گالی یا پھبتی کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

اپنی زندگی کے آخری ایام میں ٹیلویژن کے لیے انتظار حسین کو انٹرویو دیتے ہوئے، غزل سنانے کی فرمائش کیے جانے پر انہوں نے کہا: "___ لائیے تمہیں کچھ شعر سنا دیتا ہوں یہ غزل اس میں تھوڑی سی خطابت ہے، مگر یہ ہے کہ بعض وجوہ سے مجھے پسند ہے؛ کہ طلوع غروب کے مناظر ہیں؛ حیرت وعبرت، کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے؛ کس طرح چیزیں ڈوبتی ہیں، ابھرتی ہیں؛ کس طرح صبح شامیں ہوتی ہیں؛ اور کچھ قرآنِ کریم کے پڑھنے والو کے لیے بھی ...... یہ کچھ دو چار شعر میں عرض کر دیتا ہوں:

سازِ ہستی کی صدا غور سے سن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن

دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سن

کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سن!

یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شورِ درا غور سے سن

کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال
شب گزیدوں کی دعا غور سے سن

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سن

دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سن

(برگِ نے)

یہاں اگر کوئی یہ کہے کہ شاعر کی شخصیت اور اس کے نظریات اور عقائد کی روشنی میں اس کے کلام کو دیکھنا، بے لاگ Objective مطالعے کے تقاضوں کے خلاف ہے تو میں جواب میں پاپا ہی کے الفاظ پیش کروں گا مذکورہ بالا انٹرویو ہی میں انہوں نے کہا تھا، "بات یہ ہے کہ جس طرح عطر کی شیشی آپ کھولتے ہیں تو خوشبو آپ کو آتی ہے، تو پھول اور باغ تو کہیں نظر نہیں آتے، تو شاعری میں میری، یہ تمام واقعات براہِ راست تو آپ کو نظر نہیں آئیں گے البتہ یہ ہے کہ وہ جو یادیں ہیں، جو زمانہ تھا ہماری غلامی کا اور جس میں ہم جینے کے لیے کوشش کر رہے تھے، ان کی تگ و دو کو میری شاعری کے آہنگ میں، رنگوں میں، لفظوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔" آگے چل کر اس سوال کے جواب میں کہ تمہارا Commietment کیا ہے، انہوں نے کہا، .... Commitment میں نے اس طرح بعض بیانات کی صورت میں تو شاید بہت کم کیا ہو، لیکن میرے کلام میں آپ کو_____ میرا تو خیال ہے کہ میں نے جو لفظ لکھا ہے وہ Commitment سمجھ کر لکھا ہے۔ پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ کو آپ دیکھیں اور میرے کلام کو دیکھیں تو ضرور اس میں وہ چیزیں دھڑکتی ہوئی نظر آئیں گی۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سجاد باقر رضوی کی کتاب کے دیباچے ،شہری فرہاد، میں وہ لکھتے ہیں، " شاعر کی شاعری اور اس کے نظریات کی ملاقات کسی مقام پر تو ہونی چاہیے۔اس ضمن میں با قاعدہ مثالیں تو مغرب کے ادب ہی میں ملیں گی لیکن اردو ادب بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں، میؔر نے اپنے تذکرے میں، غالبؔ نے اپنے خطوط میں، حالؔی نے مقدمہ شعروشاعری میں، پھر ہمارے زمانے میں فراقؔ صاحب نے اپنے مضامین میں شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا عکس ان کی شاعری میں بھی موجود ہے .... شاعر اپنے نظریات کو مسلسل تجربات، مشاہدات اور مطالعے کے بعد مرتب کرتا ہے اور شاعری میں انہیں ذائقہ بنا دیتا ہے۔شاعر کا مطالعہ اور اس کے نظریات خام رے کی طرح ہوتے ہیں جو شعر میں دم شمشیر بن کر اپنا جوہر دکھاتا ہے"

یہاں یہ باتیں، ممکن ہے کچھ لوگوں کو غیر متعلقہ لگیں لیکن میرے خیال میں ان کا ذہن نشین ہونا نہ ف ،پہلی بارش، بلکہ ناصر کاظمی کی پوری شاعری کو سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

(۳)

وہ کوئی اپنے سوا ہو تو اس کا شکوہ کروں
جدائی اپنی ہے اور انتظار اپنا ہے
(دیوان ناصر کاظمی)

" پہلی بارش، کے شاعر کی کہانی یہ بتاتی ہے کہ انسان اس دنیا میں نہ صرف اکیلا آتا ہے اور یہاں سے اکیلا جاتا ہے، بلکہ وہ یہاں رہتا بھی اکیلا ہے۔اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد، اپنے اندر جھانک کر، اپنی ذات کی مسلسل نشونما (یا زکا) کرتے رہنے سے ہی وہ سکون کی منزل (یا جنت) تک پہنچ سکتا ہے۔انسان کی ضرورتیں اسے دوسروں کے پاس بھی لے جاتی ہیں اور ان سے جدا بھی کرتی ہیں۔ ہر تعلق اور دوستی کی ایک معیاد ہوتی ہے۔ یہ میعاد تمام عمر پر بھی محیط ہو سکتی ہے، بشرطیکہ فریقین ایک دوسرے کی نشونما میں اضافے کا باعث بنتے رہیں (اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اپنی نشونما کے لیے بھی کوشش کرتے رہیں۔ظاہر ہے جو خود رک گیا، وہ کسی کو کیا آگے بڑھائے گا)۔لیکن جب روز کے ملنے والے دوست ایک دوسرے کی نشونما میں مزید کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے تو ان کا ملنا کم ہونے لگتا ہے۔ انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں:

دوست بچھڑے جاتے ہیں شوق لیے جاتا ہے دور! (برگِ نے)

اب ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ناصؔر
وہ ہم نوا جو مرے رتجگوں میں شامل تھے
(دیوان)

محبت کا معاملہ اس سے کچھ مختلف نہیں۔محبوب کے بغیر ایک پل نہ جی سکنے والا، یوں بھی سوچتا ہے:

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو
(دیوان)

شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے دل تجھے بھی بھلائے جاتا ہے (دیوان)

اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ:

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں
(برگِ نے)

وہ رشتہ جو از خود، بتدریج اور غیر محسوس طور پر ٹوٹے؛ وہ دستی جو اپنے تمام امکانات کو Explore اور Exhaust کر لے، اس کا دکھ یا ملال نہیں ہوتا، لیکن جو تعلق ادھورا رہ جائے درمیان میں کسی حادثے رنجش، بدگمانی، غلط فہمی، رقابت یا ظالم سماج کی وجہ سے منقطع ہو جائے۔ بہت تڑپاتا ہے:

کہا ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے!
(برگِ نے)

یاد آتا ہے روز و شب کوئی ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی
(برگِ نے)

"پہلی بارش کے آغاز میں کیفیت تو من شدی من تو شدم کے مصداق نظر آتی ہے۔ دورنہ حوں کا پیاسا بادل گرج گرج کر برستا ہے، دریادوں کا چڑھتا دریا ایک ہی ساگر میں گرتا ہے اور دل کی کہانی کہتے کہتے رات کا آنچل بھیگ جاتا ہے۔ سفر کی رات خوشبو کے جھونکے کی مانند گزر جاتی ہے دن کی ٹھنڈی دھوپ میں، تیری ہلال سی انگلی پکڑے / میں کوسوں پیدل چلتا تھا" اور پچھلے پہر کے نساٹے میں، "تیرے سائے کی لہروں کو / میرا سایا کاٹ رہا تھا،" غرض، "وقت کا ٹھاٹیں مارتا ساگر / ایک ہی پل میں سمٹ گیا تھا،" لیکن فراق کی منزل دور نہ تھی
:

کیسی اندھیری شام تھی اس دن بادل بھی گھر کر چھایا تھا!
رات کی طوفانی بارش میں تو مجھ سے ملنے آیا تھا!
بھیگی بھیگی خاموشی میں میں ترے گھر تک ساتھ گیا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ایک طویل سفر کا جھونکا مجھ کو دور لیے جاتا تھا!

یہ کیسی خاموشی ہے! کیا باتیں ختم ہوگئیں! کیا تمام یادوں اور سپنوں کا تبادلہ ہو چکا! یا یہ باتوں کے درمیان محض ایک وقفہ ہے؟

یہ کیسا سفر ہے! غمِ روزگار کی مجبوری، زمانے کی عائد کردہ پابندی یا ذات کی داخلی احتیاج! اگلی غزل میں ان سارے سوالوں کے جواب مل جاتے ہیں، مطلع میں دوبارہ کا لفظ بہت اہم ہے یہاں اس کا مطلب دوسری بار نہیں بلکہ ایک بامعنی (Significant) وقفے کے بعد آنا ہے گھر وہی، شام کا تارا وہی، رات وہی، سپنا وہی، مگر اب تیرے لیے لمبی تان کر پہروں سونا ممکن ہے تو اس کے برعکس، تیری نیند بھی اڑی اڑی تھی، (غزل نمبر۲)، مجھ سے بے نیاز ہونے کے عمل میں مقام آ چکا ہے۔ پھر اس نیند کو بھی، ایک انوکھے وہم کا جھونکا، اڑا اڑا دیتا ہے اور ایک دن یہ وہم تجھ کو گھیر لیتا ہے اور تو، مجھ کو سوتا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

لیکن یہ وہم کیا تھا؟ ایک نظریہ یہ ہے کہ ہر خیال وہم ہوتا ہے ______ "یہ تو ہم کا کارخانہ ہے/یاں وہی ہے جو اعتبار کیا" ______ جبکہ دوسرے زاویے سے دیکھیں تو وہم بھی ایک خیال ہی ہوتا ہے۔ دراصل ہم وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر بات کے دو رخ ہوتے ہیں جب ہم کسی سے دور ہونا چاہتے ہیں تو اس کی باتوں کے وہی معانی ہماری سمجھ میں آتے ہیں جو ہمارے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھاتے ہوں (چاہے وہ ہمیں دل وجان سے چاہتا ہو) بصورت دیگر وہ معانی جو ہمیں اس کے قریب لے جاتے ہوں (خواہ وہ ہم سے کتنا ہی بیزار ہو پر اس کے دل کی بات ہمیں بہت بعد میں پتہ چلے گی۔ پہلی بارش، میں بھی آخری غزل میں ایک ایسا ہی انکشاف ملتا ہے:

تیرا قصور نہیں میرا تھا میں تجھ کو اپنا سمجھا تھا

اب میں سمجھا، اب یاد آیا تو اس دن کیوں چپ چپ سا تھا

سو یہ اہم نہیں کہ یہ وہم کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ربط ٹوٹ چکا ہے۔ اس کا علم ابھی پوری طرح اس لیے نہیں ہوا کیونکہ جسمانی فاصلہ ابھی کم ہے۔ ایک مثال اس بات کی وضاحت کر سکے گی۔ اگر دو برابر کے پہیے ایک Tie-rod سے جڑے، ایک ہموار اور سیدھے راستے پر پہلے جا رہے ہوں اور یہ Tie-rod ٹوٹ جائے (بغیر جھٹکے کے) تو تب بھی وہ ساتھ ساتھ اسی طرح چلتے جائیں گے اور کسی کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ ان کا آپس میں تعلق منقطع ہو چکا ہے ذرا کہیں ناہموار سطح آئی اور یہ دونوں یا تو آپس میں ٹکرائے یا پھر مخالف سمتوں میں لڑھک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ اگرچہ گھومتے گھومتے وہ دوبارہ بھی ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں لیکن ملنے کے لیے نہیں بلکہ پھر بچھڑنے کے لیے۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ، میری، کیفیت میں ہنوز کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تو نے ممکن ہے خوب تجزیے اور غور وفکر کے بعد رختِ سفر باندھا ہو لیکن میرے خیال میں تجھے وہم ہی ہوا ہے تیرے آنے پر میں تیرا، منتظر تھا اور وُہ ہی، سپنا دیکھ رہا تھا۔ تو سو جاتا تو پہروں تجھے تکتا رہتا، تیری ایک صدا سنتے ہی گھبرا کر جاگ اٹھتا اور جب تک تجھ کو نیند نہ آ جاتی، تیرے پاس کھڑا رہتا: ماحول کو دلچسپ بنانے کی خاطر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اور تیرے بیزار ہو جانے کے ڈر سے نئی انوکھی بات سنا کر تیرا جی بہلاتا، اس آرزو میں اور اس امید پر کہ تیرے دل میں جانے کا خیال نہ آئے۔ میرے لیے وقت اتنی تیزی سے گزر گیا کہ ایک مہینہ ایک پل کے برابر محسوس ہوا۔ میرے لیے ابھی اس تعلق میں بہت کچھ باقی تھا، تیری طلب کم نہ ہوئی تھی، اسی لیے:

آنکھ کھلی تو تجھے نہ پا کر میں کتنا بے چین ہوا تھا

آج وہ سیڑھی سانپ بنی تھی کل جہاں خوشبو کا پھیرا تھا

اگلی غزل، میری اور تیری، ان کیفیات کی مزید نمایاں کرتی ہے:

تجھ بن گھر کتنا سُونا تھا دیواروں سے ڈر لگتا تھا

بھولی نہیں وہ شامِ جدائی میں اس روز بہت رویا تھا

تجھ کو جانے کی جلدی تھی اور میں تجھ کو روک رہا تھا

تجھ سے بچھڑ کر 'میری' حالت غیر ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے خیال ستاتے ہیں۔ سناٹے میں کوئی دور سے آوازیں دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ باہر کے مناظر کچھ کے کچھ دکھائی دیتے ہیں۔ نیند بھی خوف اور وسوسوں سے خالی نہیں ہوتی۔ بارہویں غزل میں ایسے ہی ایک ڈراؤنے خواب کا بیان ہے۔

تیرہویں غزل میں کہانی کا مرکزی کردار یا، ہیرو، تنہائی کے آتش دان میں لکڑی کی طرح جلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی خوشی اور تسکین کے لیے وہ اپنے سے باہر دکھنے کا عادی اور محتاج ہے۔ ابھی اس نے اپنے اندر جھانکنا شروع نہیں کیا۔ اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ دوزخ اس مقام کو بھی کہتے ہیں جہاں فرد یا معاشرے کی نشو و نما رک جائے۔ اس وقت 'ہیرو' کی یہی کیفیت ہے۔ اسے جینا محال نظر آتا ہے_____"دم ہونٹوں پر آ کے رُکا تھا/ یہ کیسا شعلہ بھڑکا تھا." زندگی میں اس کی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ اب اسے باہر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا:

میری آنکھیں بھی روتی تھیں! شام کا تارا بھی روتا تھا!

گلیاں شام سے بجھی بجھی تھیں چاند بھی جلدی ڈوب گیا تھا

لیکن خوش قسمتی سے اس کا دم نکل نہیں جاتا بلکہ حیات سے اس کا رشتہ بحال ہو جاتا ہے

قیامت رہا اضطراب ان کے غم میں
جگر پھر گیا رات ہونٹوں تک آ کر

جانکنی کے عالم میں اسے دوزخ کی ایک واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ "آگ کے سپنے اسے ایک رسیلے جرم کا چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ اسے احساس ہوتا کہ وہ زندگی جیسی نعمت سے لاپرواہی برتنے کا مجرم بن رہا ہے۔ اسے اپنی وہ امکانی حالت نظر آتی ہے جو مسلسل بے مقصد جلتے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کڑھتے رہنے سے ہو سکتی ہے:

پیاسی لال لہو سی آنکھیں	رنگ لبوں کا زرد ہوا تھا
بازو کھینچ کر تیر بنے تھے	جسم کماں کی طرح ہلتا تھا
ہڈی ہڈی صاف عیاں تھی	پیٹ کمر سے آن ملا تھا!
وہم کی دیمک نے چہرے پر	مایوسی کا جال بُنا تھا
جتنی سانسوں کی گرمی سے	شیشہ تن پگھلا جاتا تھا

مایوسی جہنم کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔لفظ ابلیس، بلس، سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں، مایوسی، ابلیس، وہ جو مایوس ہو گیا۔وہ آدم کے ارض پر خلیفہ بنائے جانے پر مایوس Disappoint ہوا؛ اور جو خود مایوس ہو جائے وہ دوسروں کو بھی مایوس کرتا ہے، ان کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے؛ اور جنہیں اس سے پناہ نہ مل سکے، جو اس کے بہکاوے میں آ جائیں، ان کا مقدر بھی دوزخ ہے

'پہلی 'بارش، کا ہیرو اس انجام سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں جسمانی زندگی کی حدیں ختم ہونے لگتی ہیں اور موت دکھائی دینے لگتی ہے۔سزا اور جزا کی منزل آ جاتی ہے۔اسے حیات بعد الموت کا وجود محسوس ہونے لگتا ہے۔وہ ڈر جاتا۔اسے زندگی کا وقفہ بہت غنیمت نظر آتا ہے۔اس کے اندر جینے کی شدید خواہش اور طلب پیدا ہوتی ہے ____ ، پیاسی کونجوں کے جنگل میں / میں پانی پینے اترا تھا۔"

کونج (یا قاز) ایک ایسا پرندہ ہے جو موسمِ سرما میں گرم خطوں میں چلا آتا ہے اور اس کے غول کے غول دریا کے کناروں پر ملتے ہیں اور قطار باندھ کر اڑتے ہیں۔گویا یہ حرارت اور پانی یعنی حیات کے لیے ناگزیر عناصر کا طالب اور متلاشی رہتا ہے۔ایک تخلیقی آدمی کی زندگی بھی تلاش اور جستجو سے عبارت ہوتی ہے۔نادیدہ کے درشن کی پیاس اور نا آفریدہ کی تخلیق کی لگن اسے سرگرداں پھراتی ہے۔یہ دنیا اس کے لیے، پیاسی کونجوں کا جنگل، ہے۔کونجوں اور تخلیق انسانوں کی ہم سفری اور ہم نوائی کا ذکر، ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے مکالمے، دنیا اسیم، (مطلوعہ، سویرا) کے پیش لفظ میں نہایت واضح اور بھرپور طور ملتا ہے۔"، جب چلتے چلتے ہنگامِ زوال آیا، دل نڈھال ہوا اور حال بے حال ہوا۔ایک سوار نے سمندِ عزم کی باگ چھوڑی اور بولا کہ اس بیابان میں سفر بے اثر ہے، خاک پھانکنا بے ثمر ہے۔خیال ترک کریں اور پلٹ کر بچھڑوں سے جا ملیں۔

ہم سفر بولا کہ جس راستے کو ہم نے چھوڑا وہ ہم پر بند ہوا۔آگے کی راہیں کھلی ہیں، شوقِ سفر شرط ہے اور ہر قدم راستہ بھی ہے اور منزل بھی۔

انہوں نے باگیں سنبھالیں اور پھر چلنا شروع کر دیا۔اوپر تانبا آسمان، نیچے چٹیل میدان ہنسان بیابان، دھوپ میں جلتے بلتے پتھریلے ٹیلے، ریت کے رستے، اکا دکا بے برگ درخت، کوئی راہ گیر نظر نہ آیا کہ سُراغ منزل کا لیتے اور پتا پانی کا پاتے۔دور کبھی دھول اڑتی نظر آتی تو خیال گزرتا کہ اس دشتِ بے آب میں مسافر بھی ہیں کہ اپنے طور کڑے کوسوں کا سفر کرتے ہیں۔دن ڈھلنے لگا تو دل فزوں نڈھال

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہوا۔گلا پیاس سے خشک ہوا اور ابلق پسینے میں شرابور اور تھکن سے چور ہوئے کہ اتنے میں سر پہ پیاسی آوازوں کی لکیر ہویدا ہوئی۔ دیکھا کہ قازوں کی ایک قطار ہے کہ قائیں قائیں چیختی ہے اور فضا میں تیرتی جاتی ہے۔اس آواز کو انہوں نے غیب کی ندا جانا اور پانی کا پیغام سمجھا۔ گھوڑوں کو ایڑ دی اور قازوں کی ندا کے ہم رکاب بول سرپٹ دوڑے کہ ابلقوں کی ٹاپوں سے دشت گونجا اور چنگاریا اڑیں۔

یہ پیش لفظ مذکورہ غزل میں داخلے کا راستہ بن سکتا ہے۔اس غزل میں آگ کے مقابلے میں پانی دکھائی دیتا ہے۔جھلستے اور جلتے رہنے کے بعد یہ پانی اسے اتنا ٹھنڈا لگتا ہے کہ اس کے ہاتھ دیر تک کانپتے رہتے ہیں۔وہ پانی میں جھانکتا ہے تو اسے اپنے بھیتر کی گہرائیاں اور وسعتیں نظر آتی ہیں۔اس کی آنکھیں جھانکتی ہی چلی جاتی ہیں۔زندگی کے تقاضوں اور مرحلوں کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا جسم تھک کر چور ہو جاتا ہے۔پانی اسے للکارتا ہے۔پانی اتنا چپ چپ اور گم سم ہے گویا باتیں کر رہا ہو (مجھ سے باتیں کرتی ہے / خاموشی تصویروں کی (دیوان)} وہ پہلی بار اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔

اب وہ ایک نئے دیس میں اترتا ہے جہان کا رنگ، (اس کے لیے) نیا ہے یہاں دھرتی سے آکاش ملا تھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ارض و سما کے قوانین میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے Interpenetrate کرتے ہیں۔(انسانوں نے ارض و سما کو ہمیشہ بالکل الگ الگ اور ایک دوسرے سے لاتعلق قرار دیا ہے، حالانکہ ارض و سما کے بہت گہرے رشتے ہیں۔ ہر طرح کی نعمتوں کا نزول سما سے ارض پر ہوتا ہے) یہاں انسانوں کے لیے نہ صرف افقی بلکہ عمودی یا ارتقاعی ترقی کے لامتناہی اور مسدود امکانات کھلے ہیں۔وہ جس حد تک چاہیں آگے جا سکتے ہیں جتنا چاہیں بلند ہو سکتے ہیں۔

یہاں دور کے دریاؤں کا سُونا، ہرے سمندر میں گرتا ہے چلتی ندیاں ہیں اور گاتے نوکے پانی کی بہتات کا یہ عالم ہے کہ سارا شہر گویا نوکوں ہی میں بسا ہے۔ یہاں پانی اور زندگی واضح اور مکمل طور پر ایک ہو جاتے ہین۔شاید 'پانی' ہی کی طلب اسے یہاں لائی ہے۔وہ ابھی تک تشنہ ہے---"ہنستا پانی، روتا پانی / مجھ کو آوازیں دیتا تھا۔" نئے دیس میں اترنا ایک نئے جیون کا آغاز کرنے کے مترادف لگتا ہئے۔وہ گھر، رات، اور وہ سپنا، اب ماضی کا حصّہ بن چکا ہے۔تیرا دھیان، مفلوج کرنے کی بجائے سہارا دیتا ہے۔اسے زندگی کے دریا کی لہروں کا مقابلہ کرنے کی جرئات اور تشکستی دیتا ہے______ "تیرے دھیان کی کشتی لے کر / میں نے دریا پار کیا تھا۔"

اس کے بعد وہ اک بستی میں اترتا ہے جو غالباً اسی نئے دیس میں ہے۔سر ماندی کے گھاٹ پہ جاڑے کا پہلا میلا ہے۔رقص و سرود کی محفل سجی ہے۔کچھ خوشبو لے کر وہ اس بستی سے نکلتا ہے۔لیکن:

تھوڑی دیر کو جی بہلا تھا　　پھر تیری یاد نے گھیر لیا تھا
یاد آئی وہ پہلی بارش　　جب تجھے ایک نظر دیکھا تھا

______　　______

یاد آئیں کچھ ایسی باتیں:　　میں جنہیں کب کا بھول چکا تھا

اگلی غزل میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا تیرے شہر سے پھر گزر ہوتا ہے۔ ہوا اتنی تیز اور اداس ہوتی ہے کہ اس کا چراغ دل بجھ جاتا ہے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اس کا دل ہنوز سونا ہے اور تنہائی پیاسی جنّت ابھی دور ہے۔ اسی عالم میں تجھ، سے مشابہ ایک مسافر ریل چلنے پر اس کے مقابل آ بیٹھتا ہے۔ یہ مشابہت کچھ دیر کے لیے وجہِ تسکین بنتی ہے لیکن جدائی کا موڑ ہر سفر میں ہوتا ہے۔ تیزی طرح تیرا بدل، بھی بچھڑ جاتا ہے۔

کوئی بھی ہمسفر نہ تھا شریکِ منزل جنوں

بہت ہوا تو رفتگاں کا دھیان آ کے رہ گیا

وہ شخص جس سے تعلق اپنے فطری انجام کو پہنچ کر ٹوٹا ہو جس سے دوستی اپنے تمام امکانی طے کر چکی ہو، عرصہ دراز کے بعد ملے تو ایک انجانی سی خوشی ہوتی ہے۔

پھر ایک طویل ہجر کے بعد

صحبت رہی خوشگوار کچھ دیر !

(برگِ نے)

کوئی نیا موضوع نہ بھی چھڑے، کوئی نئی بات نہ بھی ہو، یادیں ہی تازہ ہو کر نئی بہار دکھا دیتی ہیں۔ ماضی اتنی قوت اور شدت سے رگ و پے میں داخل ہوتا ہے کہ مردہ لمحے زندہ ہو جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہیکو یا کوئی کھوئی ہوئی قیمتی متاع پھر مل گئی ہو۔ حالانکہ دل نے کبھی اس سے دوبارہ ملنے کی تمنا نہیں کی ہوتی، پھر بھی اس سے ملاقات ہونے پر ایسی خوشی ہوتی ہے جیسے کوئی خواہش پوری ہو گئی ہو۔ ظاہر ہے، اس سے جدا ہونے پر کوئی زخم لگا ہوتا تو اب ہرا ہوتا۔ یادوں کے پھول ہوتے ہیں، مہک اٹھتے ہیں۔

اس کے برعکس عجیب بات ہے کہ ایسا شخص جس کے فراق میں آدمی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا رہا ہو جس کی ایک جھلک دیکھنے کو آنکھیں پتھرا گئی ہوں، مل جائے تو رنج کم نہیں ہوتا۔ بقول حفیظ ہوشیار پوری۔

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے

تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

دیوان میں بھی ایک شعر ہے۔

تجھ سے مل کر بھی دل کو چین نہیں

درمیاں پھر وہی سوال پڑا

Heraclitus نے کتنا درست کہا ہے: ہم ایک ہی دریا میں دو بار قدم نہیں رکھ سکتے۔ "وقت ہر لحظ ہم میں اور کائنات میں تبدیلیاں لاتا چلا جاتا ہے۔ ہمیں پرانی قیود سے رہا کر کے نئے تقاضوں کی زنجیروں میں باندھ دیتا ہے۔ ہمارے شوق، حاجتیں، پسند ناپسند بدلتے رہتے ہیں مگر وہ تعلق جو ادھورا رہ جاتا ہے، ویسے کا ویسا رہتا ہے جو دوست بچھڑ جاتا ہے، ہمیں اسی طرح یاد رہتا ہے جیسا کہ وہ تھا۔ وہ ہمارے ذہنوں میں پروان نہیں چڑھتا۔ چنانچہ جب ہم اس سے ملتے ہیں تو وہ حقیقت میں تو کچھ کا کچھ ہو چکا ہوتا ہے لیکن ہماری نظریں اسی کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں جس سے ہم جدا ہوئے تھے۔ وہ کہیں ہو تو ملے۔ رنج اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس کے ملنے کی جو ایک موہوم سی امید

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہوتی ہے وہ بھی دم توڑ دیتی ہے۔ وہ مل کر بھی نہیں ملا۔

کوئی اور ہے نہیں تو نہیں مرے روبرو کوئی اور ہے
بڑی دیر میں تجھے دیکھ کر یہ لگا کہ تو کوئی اور ہے (دیوان)

اب یہ اور بات ہے کہ ہم اس ملاقات میں دل کی تسلّی کے لیے بھی کوئی پہلو ڈھونڈ لیں۔

دیاروں کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا (دیوان)

مگر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آمنا سامنا ملاقات نہیں کہلا سکتا اور اگر اسے ملاقات کہا بھی جائے تو بھی:

چاند نکلا تھا مگر رات نہ تھی پہلی سی
یہ ملاقات، ملاقات نہ تھی پہلی سی!

(دیوان)

اور دو چار بار ایسا، آمنا سامنا، اور ہو جائے تو کیفیت بالآخر یہ ہو جاتی ہے۔

برابر ہے ملنا نہ ملنا ترا
بچھڑنے کا تجھ سے قلق اب کہا

(برگِ نے)

'پہلی بارش، کے مرکزی کردار کو بھی ایسی ہی ایک اتفاقی اور غیر متوقع، ملاقات کا بھرپور تجربہ ہوتا ہے:

پل پل کانٹا سا چبھتا تھا
یہ ملنا بھی کیا ملنا تھا

کتنی باتیں کی تھیں لیکن!
ایک بات سے جی ڈرتا تھا

تیرے ہاتھ کی چائے تو پی تھی
دل کا رنج تو دل میں رہا تھا

کسی پرانے وہم نے شاید
تجھ کو پھر بے چین کیا تھا

میں بھی مسافر تجھ کو بھی جلدی
گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا

اک اجڑے سے اسٹیشن پر
تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا

تیرے ساتھ ترے ہمراہی
میرے ساتھ مرا رستا تھا

رنج تو ہے لیکن خوشی ہے
اب کے سفر ترے ساتھ کیا تھا

وہ ملاقات کی بدل ہوئی نوعیت سے نہ صرف پوری طرح واقف ہو جاتا ہے بلکہ اسے قبول بھی کر لیتا ہے اور محض کچھ دیر کی جسمانی ہمراہی کو

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

غنیمت جانتا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ ہم سفری کی آرزو نہ صرف بے سود بلکہ باعثِ رنج بھی ہے۔

تعلق کی اصل نوعیت کا شعور اپنی داخلی اور خارجی تبدیلیوں کا علم اور قبولیت اسے دوزخ سے مکمل طور پر نکال لیتے ہیں۔ آگہی کی بدولت اسے جنت کا نقشہ دکھائی دیتا ہے جہاں ہریالی ہی ہریالی ہے، نور ہی نور، رس ہی رس، مٹھاس ہی مٹھاس؛ جہاں کوئی وسوسے پیدا کرنے والا نہیں بلکہ، سایا سایا راہ نما ہے، جہاں گاتے پھول، ہیں اور بلاتی شاخیں، ہیں اور پتا پتا دستِ دعا ہے۔

اور یہ جنت اسے جلد ہی بھی جاتی ہے۔ تنہائی میں دریا دریا روتے ہوئے اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ تنہائی کا تنہا سایا دیر سے اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ جب سارے ساتھی چھوڑ گئے تھے تو تنہائی کا پھول کھلا تھا۔ تنہائی میں یادِ خدا بھی تھی اور خوفِ خدا بھی۔ تنہائی محرابِ عبادت بھی تھی اور منبر کا دیا بھی؛ اس کا پائے شکستہ بھی تھا اور دستِ دعا بھی۔ غرض اس کا سب کچھ تنہائی میں تھا، اس کا سب کچھ تنہائی تھی۔ وہ جنت جسے وہ باہر ڈھونڈ رہا تھا، اس کے دل میں چھپی تھی۔ وہ تسلیم کر لیتا ہے کہ تنہا تھا اور تنہا ہے۔ اس کے دل کی جنت تنہائی ہے۔

جنت کی دریافت اور حصول کے بعد وہ تجھ سے اپنے تعلق کا ایک بار پھر جائزہ لیتا ہے۔ اب اسے یہ رشتہ اپنے صحیح رنگوں میں نظر آتا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ قصور اس کا ہی تھا جو وہ تجھ کو اپنا سمجھا تھا اب پتہ چلا کہ، وہ سب کچھ ہی دھوکا تھا؛ حقیقت کچھ اور ہی تھا۔ آخر میں وہ اپنی، تقدیر، کو قبول کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

وہی ہوئی ہے جو ہوئی تھی — وہی ملا ہے جو لکھا تھا!
دل کو یونہی سا رنج ہے ورنہ — تیرا میرا ساتھ ہی کیا تھا

کس کس بات کو روؤں ناصرؔ
اپنا لہنا ہی اتنا تھا !

لیکن اس سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ کائنات میں ازل سے ابد تک جو کچھ ہونا ہے وہ پہلے سے طے شدہ ہے ،لکھا جا چکا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم نہیں کی جا سکتی ،ہمیں یاد رکھنا چاہیں کہ اس نے پہلی ہی غزل میں کہا تھا اور وہ بھی خدا کو مخاطب کر کے کہ رہ ایسا صبرِ صمیم ہے جس نے اپنی مرضی سے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے بارِ امانت سر پہ لیا تھا۔ وہ جانوروں کی طرح ایک ہی بات کرنے پر ایک ہی راہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں۔ اسے انتخاب کرنے کا Privilege حاصل ہے وہ ایسا اہم عظیم ہے جس کو جن و ملک نے سجدہ کیا تھا۔ اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ:" جو پایا ہے وہ تیرا ہے/ جو کھویا وہ بھی تیرا تھا"، تو اس سے لاچاری کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ تو صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ سب کچھ اللہ کی ملکیت ہے؛ انسان اس میں سے کچھ پا لیتا ہے، کچھ کھو دیتا ہے، اس کی خواہشوں کی تکمیل کا دارومدار اس کے اپنے فیصلوں اور اپنی کوششوں پر ہے:

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دیکھ کے تیرے دیس کی رچنا میں نے سفر موقوف کیا تھا

نئی انوکھی بات سنا کر اور تیرا جی بہلاتا تھا

تجھ کو جانے کی جلدی تھی اور میں تجھ کو روک رہا تھا

ایک ہی لہر نہ سنبھلی ورنہ میں طوفانوں سے کھیلا تھا

انسان کے خیالات، اس کا اندازِ نظر، اس کی زندگی کو دوزخ بھی بنا سکتے ہیں اور جنت بھی جنت تلاش کرنے پر ملتی ہے۔

وہ جنت مرے دل میں چھپی تھی
میں جسے باہر ڈھونڈ رہا تھا

اس کا نظریۂ تقدیر ہے کہ ہر گوشے کی حدود ہوتی ہیں اور ان حدود سے جھگڑنا، انہیں توڑنے کی کوشش کرنا نہ صرف بے سود بلکہ مضر بھی ہے اور ان کو جاننے اور تسلیم کر لینے ہی میں فلاح ہے:

ان سے الجھ کر بھی کیا کرتا تین تھے وہ اور میں تنہا تھا

میں بھی مسافر کو بھی جلدی گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا

اب تجھے کیا یاد دلاؤں اب تو وہ سب کچھ ہی دھوکا تھا

دل کو یونہی سا رنج ہے ورنہ تیرا میرا ساتھ ہی کیا تھا

"وہی ہوئی ہے جو ہونی تھی، سے مراد ہے کہ جو کچھ ہو سکتا تھا وہی ہوا ہے علت اور معلول میں ایک ناگزیر رشتہ ہوتا ہے۔ وہی ملا ہے جو لکھا تھا، ور اپنا لہنا ہی تنا تھا کے معنی ہیں کہ جو بویا تھا وہی کاٹا جو کیا تھا اس ہی کا صلہ ملا۔ انسان کو ملی ہوئی صلاحیتوں کے کئی (مگر تعداد یں مقرر ا متزاجات ممکن ہیں، مگر وہ ان میں سے ایک ہی کا انتخاب کر سکتا ہے اور کچھ چننے کے لیے بہت کچھ چھوڑنا بھی پڑتا ہے۔ انسان کا اختیار اس کی مجبوری بھی ہے اور اس کی مجبوری ہی میں اس کا اختیار مضمر ہے۔ زندگی ہر لحظہ چننے اور مسترد کرتے رہنے کا نار ہے لیکن انسن ایک بار فیصلہ کر لے اور اس کے مطابق عمل پیرا تو پھر اس عمل کے عواقب کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ انتخاب سے پہلے آدمی کے سامنے کئی راہیں کھلی ہوئی ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک پر چل نکلنے کے بعد باقی تمام اس کے لیے بند ہا جاتی ہیں۔ اب اگر بعد کو اسے یہ علم یا احساس ہو کہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اس کا فیصلہ غلط تھا؛ یا اسے چھوڑی ہوئی راہوں میں کشش محسوس ہونے لگے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مجبور اور بے بس ہے انسان ہر وقت ہر جگہ نہیں ہو سکتا۔ وہ سب کچھ کر نہیں سکتا، وہ سب کچھ ہو نہیں سکتا۔

(۴)

آشنا درد سے ہونا تھا کسی طور ہمیں
تو نہ ملتا تو کسی اور سے بچھڑے ہوتے

'پہلی بارش محض دو اشخاص کے ملنے اور بچھڑنے کی کہانی نہیں ہے۔ میں اور 'تو' علامتیں ہیں داخلی اور خارج کی؛ نمائندے میں فرد اور معاشرے کے۔ "انسان کو معاشرے اور تنائی دونوں کی ضرورت ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے زوج ہیں یا اس کی زکا دونوں کی صحیح ترکیب ہی سے ممکن ہے۔ شاید اسی لیے انسان دوسرے انسان سے جدا ہو کر تنہا ہو کر، رفع حاجت کے بے جانے ہیں، وہاں وہ خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہاں ان کو عجیب عجیب حاجت کے لیے جانے ہیں۔ وہاں وہ خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہاں ان کو عجیب عجیب باتیں سوجھتی ہیں جن تک ان کے شعور کی رسائی نہیں ہوتی۔ مارٹن لوتھر نے اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ محبت کی پرورش کے بے بھی تنہائی اور خاموشی کی ضرورت ہے۔" [اقتباس از ناصر کاظمی: ایک دھیان، از شیخ صلاح الدین] لیکن عام آدمی تو تنہائی سے بھاگتا ہے۔ وہ اسیر بزم، ہوتا ہے۔ "تنائی عام آدمی کو اس لئے ڈراتی ہے کہ اس دنیا کے ہنگاموں کا شور ماند پڑ جاتا ہے اور کان خاموشی کا نغمہ سننے کی تاب نہیں لا پاتے، اس کے لیے دل کے کان کھولنے پڑتے ہیں۔ عام آدمی کو یہ عمل حالتِ نزع کے ممثل نظر آتا ہے۔ وہ گھبرا جاتا ہے، تنہائی سے نکل بھاگتا ہے اور اپنے آپ کو ہجوم میں گم کرنے کی کوشش کرما ہے۔" چنانچہ خیالات اور جذبات کی پرورش کے لیے قدرت نے انسان کو لازماً بلکہ جبراً تنہائی خاموشی کے لمحات میں ڈالنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ حادثات بیماریاں، پیاروں کا بچھڑنا وغیرہ، ایسے واقعات ہیں جو اسے درد سے آشنا کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف اور کٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔ لوگوں کی صحبت میں اس کا جی نہیں لگتا بعض اوقات تو اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ درد اسے کانٹے کی طرح مسلسل ہمہ وقت چبھتا رہتا ہے۔ زندگی بوجھل اور کٹھن ہو جاتی ہے۔ ایسے میں یا تو وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے اور موت کے راستے پر چل نکلتا ہے یا پھر اس کے اندر کا تخلیقی انسان جسے ناصر کاظمی، شاعر، کہتے ہیں، بیدار ہوتا ہے؛ اس کی بہت کی خفتہ اور نہفتہ صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں، اور وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔

درد کانٹا ہے اس کی چبھن پھول ہے
درد کی خامشی کا سخن پھول ہے !

(دیوان)

ناصر کاظمی کے ہاں شاعری کے معنی بہت وسیع تھے۔ اپنے اسی آکری انٹرویو میں کہتے ہیں: مجھے غزل، قطعہ، رباعی، آزاد نظم وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں ہے تمہیں پتہ ہے شاعری صرف مصرعے لکھنے کا نام نہیں۔ شاعری تو ایک نقطہ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا، چیزوں کو دیکھنے کا، ان کو موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے۔" اسی گفتگو کا ایک ٹکڑا املا خطہ ہو:

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ناصر: .... آپ یہ دیکھئے کہ بعض لوگ مختلف شعبوں میں پڑے ہیں اور شاعر ہیں، تخلیقی لوگ ہیں۔ ننھے ننھے مزدور۔ میں نے تو دفتروں میں بعض کلرکوں کو دیکھا ہے اور بعض ریڈیو میں،، بیض ادھر ادھر اور اداروں میں؛ وہ بڑے تخلیق لوگ ہیں؛ وہ بڑے خاموش خادم ہیں۔ اس سے برا کون شاعر کون ہے ..... انجن ڈرائیور سے بڑا جو کتنے ہزار اور کتنے سو مسافروں کو لاہور سے کراچی لے جاتا ہے اور کراچی سے واپس لاتا ہے۔ مجھے یہ آدمی بہت پسند ہے اور ایک کانٹے والا پھاٹک بند کرنے والا؛ یہ بھی شاعر ہیں، میری برادری کے لوگ اپنا اپنا Role ہے آپ کو پتہ ہے اگر وہ پھاٹک کھول دے جب گاڑی آ رہی ہو، تو کیا قیامت آئے؟ بس شاعر کا بھی یہی کام ہے کہ کس وقت پھاٹک بند کرنا ہے؛ جب گاڑی گزرتی ہے، اس وقت۔

انتظار: لیکن ایسے شاعر بھی تو تم نے دیکھے ہوں گے کہ جب پھاٹک کو بند رہنا چاہیے، اس وقت کھول دیتے ہیں اور جب کھولنا چاہیے، بند کر دیتے ہیں۔

ناصر: کیونکہ وہ صرف اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر جو ہے وہ ساری انسانیت کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب اوروں کا بھلا ہو گا تو اس کا اپنا بھلا خود بخود ہو گا۔

گویا انسان جو بھی۔ جہاں بھی ہو، تخلیقی ہو سکتا ہے؛ اسے تخلیقی ہونا چاہیے ایسی اس کی معراج ہے لیکن اس معراج کو پانے کے لیے اسے تنہائی کے جوکھم سے گزرنا پڑے گا۔ ناصر کاظمی نے اپنے ایک ریڈیو فیچر؛ شاعر اور تنہائی' (مطبوعہ، خشک چشمے کے کنارے) میں لکھا تھا:

"روزِ ازل سے تنہائی شاعر کا مقدر ہے [یہاں مقدر سے مراد مجبوری نہیں بلکہ اس کے قرآنی معانی پر توجہ دینا ہو گی۔ (اللہ نے ہر شے پیدا کی اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مقرر کر دیا) ____ ہر شے کے خواص اور امکانات اس کی تقدیر ہیں۔ اقبال کے ہاں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔] تخلیق کی لگن اسے خلوتوں میں لیے پھرتی ہے اور حقیقت ہے کہ انسانی تہذیب کا سورج تنہائی کے غاروں ہی سے طلوع ہوا۔ اس لیے تنہائی تخلیق زندگی کے لیے ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔ تخلیق انسان زندگی کے لیے تنہائی کے دکھ اٹھاتا ہے اور جب اس بھری دنیا میں وہ اکیلا رہ جاتا ہے تو اپنے معبود حقیقی کے حضور یوں فریاد کرتا ہے ۔

تیری خدائی سے ہے میری جنوں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو

انسان اپنے چار سو سے باہر نہیں نکل سکتا۔ آزادی انسان کی ازلی آرزو ہے لیکن تنہائی سے عہد نامہ کیے بغیر یہ آزادی ممکن نہیں۔

دنیا کی ہر شے تنہائی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اس عالم کی تمام مخلوقات تنہائی کے پردوں ہی میں نشو و نما پاتی ہیں۔ انسان شعور رکھتا ہے، اس لیے وہ تمام مخلوقات کے مقابلے میں سب سے زیادہ حساس ہے۔ شعور آگہی کا یہ آشوب اسے آسمان و زمین کی وسعتوں میں حیران و سرگرداں لیے پھرتا ہے۔ شاعر کی تنہائیوں نے اس دنیا کے گوشے گوشے کو ایک حیاتِ تازہ بخشی ہے اور اس کی تنہائی کا یہ سفر ابد تک جاری رہے گا......"

" پہلی بارش کے مرکزی کردار کی زندگی میں بھی ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب اس کے اندر کا شاعر بیدار ہوتا ہے اور اسے ایک نئی دنیا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تخلیق کرنے پر ایک نیا طرزِ زیست دریافت کرنے اور اپنانے پر مجبور کرتا ہے ______ پچھلی رات کی تیز ہوا میں / کورا کاغذ بول رہا تھا۔" وہ جب تک غیر تخلیقی زندگی بسر کرتا رہا، کمزور، خوف زدہ اور محتاج رہا؛ تنہائی اس کے لیے دوزخ تھی جس میں وہ " لکڑی کی طرح جلتا تھا" لیکن جب اسے شعور ملا، اس کا احساس جاگا، اس کے اندر تخلیقی سوتے پھوٹے؛ وہ وقومی جرأت منداور خدمختار ہو گیا؛ اس نے اپنی جنت کو پالیا، لیکن کہیں باہر نہیں بلکہ:

وہ جنت مرے دل میں چھپی تھی
میں جسے باہر ڈھونڈ رہا تھا
تنہائی مرے دل کی جنت !
میں تنہا ہوں میں تنہا تھا

باصرِ سلطان کاظمی

اگست ۱۹۸۳ء

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پہلی بارش

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

شفیقہ بیگم کے نام

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لِکھا تھا

☆

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لِکھا تھا

میں وہ صبرِ صمیم ہوں جس نے
بار امانت سر پہ لیا تھا

میں وہ اسمِ عظیم ہُوں جس کو
جِنّ و مَلک نے سجدہ کیا تھا

تُونے کیوں مِرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا

جو پایا ہے وہ تیرا ہے
جو کھویا وہ بھی تیرا تھا

تُجھ بِن ساری عُمر گزاری
لوگ کہیں گے تُو میرا تھا

پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

تُو جب میرے گھر آیا تھا
مَیں اِک سپنا دیکھ رہا تھا

☆

تُو جب میرے گھر آیا تھا
میں اِک سپنا دیکھ رہا تھا

تیرے بالوں کی خوشبوں سے
سارا آنگن مہک رہا تھا

چاند کی دھیمی دھیمی ضَو میں
سانولا مکھڑا لَو دیتا تھا

تیری نیند بھی اُڑی اُڑی تھی
میں بھی کچھ کچھ جاگ رہا تھا

میرے ہاتھ بھی سُلگ رہے تھے
تیرا ماتھا بھی جلتا تھا

دو رُوحوں کا پیاسا بادل
گرج گرج کر برس رہا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دو یادوں کا چڑھتا دریا
ایک ہی ساگر میں گرتا تھا

دل کی کہانی کہتے کہتے
رات کا آنچل بھیگ چلا تھا

رات گئے سویا تھا لیکن
تُجھ سے پہلے جاگ اُٹھا تھا

☆☆☆

میں جب تیرے گھر پہنچا تھا
تُو کہیں باہر گیا ہُوا تھا

☆

میں جب تیرے گھر پہنچا تھا
تُو کہیں باہر گیا ہُوا تھا

تیرے گھر کے دروازے پر
سُورج ننگے پاؤں کھڑا تھا

دیواروں سے آنچ آتی تھی
مٹکوں میں پانی جلتا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تیرے آنگن کے پچھواڑے
سبز درختوں کا رمنا تھا

ایک طرف کچھ کچّے گھر تھے
ایک طرف نالہ چلتا تھا

اِک بُھولے ہوئے دیس کا سپنا
آنکھوں میں گُھلتا جاتا تھا

آنگن کی دیوار کا سایہ
چادر بن کر پھیل گیا تھا

تیری آہٹ سُنتے ہی میں
کچّی نیند سے چونک اُٹھا تھا

کِتنی پیار بھری نرمی سے
تُو نے دروازہ کھولا تھا

میں اور تُو جب گھر سے چلے تھے
موسم کِتنا بدل گیا تھا

لال کھجوروں کی چھتری پر
سبز کبوتر بول رہا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ڈور کیپیڑ کا جلتا سایہ
ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا

☆☆☆

شام کا شیشہ کانپ رہا تھا
پیڑوں پر سونا بکھرا تھا

☆

شام کا شیشہ کانپ رہا تھا
پیڑوں پر سونا بکھرا تھا

جنگل جنگل، بستی بستی
ریت کا شہر اُڑا جاتا تھا

اپنی بے چینی بھی عجب تھی
تیرا سفر بھی نیا نیا تھا

تیری پلکیں بوجھل سی تھیں
میں بھی تھک کر چُور ہوا تھا

تیرے ہونٹ بھی خشک ہوئے تھے
میں تو خیر بہت پیاسا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کھڑکی کے دھندلے شیشے پر
دو چہروں کا عکس جما تھا

جگمگ کنکریوں کا
دشتِ فلک میں جال بچھا تھا

تیرے شانے پر سر رکھ کر
میں سپنوں میں ڈوب گیا تھا

یُوں گزری وہ رات سفر کی
جیسے خوشبو کا جھونکا تھا

☆☆☆
بدن کا پُھول ابھی جاگا تھا
دُھوپ کا ہاتھ بڑھا آتا تھا

☆
دن کا پُھول ابھی جاگا تھا
دُھوپ کا ہاتھ بڑھا آتا تھا

سُرخ چناروں کے جنگل میں
پتّھر کا اِک شہر بسا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پیلے پتھریلے ہاتھوں میں
نیلی جھیل کا آئینہ تھا

ٹھنڈی دُھوپ کی چھتری تانے
پیڑ کے پیچھے پیڑ کھڑا تھا

دُھوپ کے لال ہرے ہونٹوں نے
تیرے بالوں کو چُوما تھا

تیرے عکس کی حیرانی سے
بہتا چشمہ ٹھہر گیا تھا

تیری خموشی کی شہ پاکر
میں کتنی باتیں کرتا تھا

تیری ہلال سی اُنگلی پکڑے
میں کوسوں پیدل چلتا تھا

آنکھوں میں تری شکل چُھپائے
میں سب سے چُھپتا پھرتا تھا

بُھولی نہیں اُس رات کی دہشت
چرخ پہ جب تارا ٹوٹا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

رات گئے سونے سے پہلے
تُو نے مُجھ سے کچھ پُوچھا تھا

یُوں گزری وہ رات بھی جیسے
سپنے میں سپنا دیکھا تھا

☆☆☆

پتّھر کا وہ شہر بھی کیا تھا
شہر کے نیچے شہر بسا تھا

☆

پتّھر کا وہ شہر بھی کیا تھا
شہر کے نیچے شہر بسا تھا

پیڑ بھی پتّھر، پھُول بھی پتّھر
پتّا پتّا پتّھر کا تھا

چاند بھی پتّھر،جھیل بھی پتّھر
پانی بھی پتّھر لگتا تھا

لوگ بھی سارے پتّھر کے تھے
رنگ بھی اُن کا پتّھر سا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پتّھر کا اک سانپ سنہرا
کالے پتّھر سے لپٹا تھا

پتّھر کی اندھی گلیوں میں
میں تجھے ساتھ لیے پھرتا تھا

گونگی وادی گُونج اُٹھتی تھی
جب کوئی پتّھر گِرتا تھا

☆☆☆

پچھلے پہر کا سنّاٹا تھا
تارا تارا جاگ رہا تھا

☆

پچھلے پہر کا سنّاٹا تھا
تارا تارا جاگ رہا تھا

پتّھر کی دیوار سے لگ کر
آئینہ تجھے دیکھ رہا تھا

بالوں میں تھی رات کی رانی
ماتھے پر دن کا راجا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اک رُخسار پہ زلف گری تھی
اک رُخسار پہ چاند کِھلا تھا

ٹھوڑی کے جگمگ شیشے میں
ہونٹوں کا سایا پڑتا تھا

چندر کرن سی اُنگلی اُنگلی
ناخن ناخن ہیرا سا تھا

اِک پاؤں میں پُھول سی جُوتی
اِک پاؤں سارا ننگا تھا

تیرے آگے شمع دھری تھی
شمع کے آگے اک سایا تھا

تیرے سائے کی لہروں کو
میرا سایا کاٹ رہا تھا

کالے پتّھر کی سیڑھی پر
نرگس کا اک پھول کِھلا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

گردنے خیمہ تان لیا تھا
دُھوپ کا شیشہ دُھندلا سا تھا

☆

گردنے خیمہ تان لیا تھا
دُھوپ کا شیشہ دُھندلا سا تھا

نکہت و نُور کو رخصت کرنے
بادل دُور تلک آیا تھا

گئے دِنوں کی خوشبو پاکر
میں دوبارہ جی اُٹھا تھا

سوتی جاگتی گُڑیا بنکر
تیرا عکس مجھے تکتا تھا

وقت کا ٹھاٹھیں مارتا ساگر
ایک ہی پل میں سمٹ گیا تھا

جنگل، دریا، کھیت کے ٹکڑے
یاد نہیں اب آگے کیا تھا

نیل گگن سے ایک پرندہ
پیلی دھرتی پر اُترا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

مُجھ کو اور کہیں جانا تھا
بس یونہی رستا بُھول گیا تھا

☆

مُجھ کو اور کہیں جانا تھا
بس یونہی رستا بُھول گیا تھا

دیکھ کے تیرے دیس کی رچنا
میں نے سفر موقوف کیا تھا

کیسی اندھیری شام تھی اُس دن
بادل بھی گِھر کر چھا یا تھا

رات کی طُوفانی بارش میں
تُو مُجھ سے ملنے آیا تھا

ماتھے پر بُوندوں کے موتی
آنکھوں میں کاجل ہنستا تھا

چاندی کا اک پُھول گلے میں
ہاتھ میں بادل کا ٹکڑا تھا

بھیگے کپڑے کی لہروں میں
کندن سونا دمک رہا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سبز پہاڑی کے دامن میں
اُس دن کتنا ہنگامہ تھا

بارش کی ترِچھی گلیوں میں
کوئی چراغ لیے پھرتا تھا

بھیگی بھیگی خاموشی میں
میں ترے گھر تک ساتھ گیا تھا

ایک طویل سفر کا جھونکا
مُجھ کو دُور لیے جاتا تھا

☆☆☆

تُو جب دو بارہ آیا تھا
میں ترا رستہ دیکھ رہا تھا

☆

تُو جب دو بارہ آیا تھا
میں ترا رستہ دیکھ رہا تھا

پھر وہی گھر، وہی شام کا تارا
پھر وہی رات وہی سپنا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تُجھ کو لمبی تان کے سوتے
میں پہروں تکتا رہتا تھا

ایک انوکھے وہم کا جھونکا
تیری نیند اُڑا دیتا تھا

تیری ایک صدا سُنتے ہی
میں گھبرا کر جاگ اُٹھتا تھا

جب تک تُجھ کو نیند نہ آتی
میں ترے پاس کھڑا رہتا تھا

نئی انوکھی بات سُنا کر
میں تیرا جی بہلاتا تھا

یُوں گزرا وہ ایک مہینہ
جیسے ایک ہی پل گزرا تھا

ایک وہ دن جب بیٹھے بیٹھے
تجھ کو وہم نے گھیر لیا تھا

صبح کی چائے سے پہلے اُسدن
تونے رختِ سفر باندھا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

آنکھ کُھلی تو تجھے نہ پاکر
میں کتنا بے چین ہُوا تھا

اب نہ وہ گھر نہ وہ شام کا تارا
اب نہ وہ رات نہ وہ سپنا تھا

آج وہ سیڑھی سانپ بنی تھی
کل جہاں خوشبو کا پھیرا تھا

مُرجھائے پُھولوں کا گجرا
خالی کھونٹی پر لٹکا تھا

پچھلی رات کی تیز ہوا میں
کورا کاغذ بول رہا تھا

☆☆☆

تُجھ بِن گھر کِتنا سُونا تھا
دیواروں سے ڈر لگتا تھا

☆

تُجھ بِن گھر کِتنا سُونا تھا
دیواروں سے ڈر لگتا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بُھولی نہیں وہ شامِ جُدائی
میں اُس روز بہت رویا تھا

تجھ کو جانے کی جلدی تھی
اور میں تُجھ کو روک رہا تھا

میری آنکھیں بھی روتی تھیں
شام کا تارا بھی روتا تھا

گلیاں شام سے بُجھی بُجھی تھیں
چاند بھی جلدی ڈوب گیا تھا

سنّاٹے میں جیسے کوئی
دُور سے آوازیں دیتا تھا

یادوں کی سیڑھی سے ناصؔر
رات اک سایا سا اُترا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

دُھوپ تھی اور بادل چھایا تھا
دیر کے بعد تجھے دیکھا تھا

☆

دُھوپ تھی اور بادل چھایا تھا
دیر کے بعد تجھے دیکھا تھا

مَیں اِس جانب تُو اُس جانب
بیچ میں پتّھر کا دریا تھا

ایک پیڑ کے ہاتھ تھے خالی
اک ٹہنی پر دِیا جلا تھا

دیکھ کے دو چلتے سایوں کو
میں تو اچانک سہم گیا تھا

ایک کے دونوں پاؤں تھے غائب
ایک کا پُورا ہاتھ کٹا تھا

ایک کے اُلٹے پیر تھے لیکن
وہ تیزی سے بھاگ رہا تھا

اُن سے اُلجھ کر بھی کیا لیتا
تین تھے وہ اور میں تنہا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

دَم ہونٹوں پر آ کے رُکا تھا
یہ کیسا شُعلہ بھڑکا تھا

☆

دَم ہونٹوں پر آ کے رُکا تھا
یہ کیسا شُعلہ بھڑکا تھا

تنہائی کے آتشداں میں
میں لکڑی کی طرح جلتا تھا

زرد گھروں کی دیواروں کو
کالے سانپوں نے گھیرا تھا

آگ کی محل سرا کے اندر
سونے کا بازار کُھلا تھا

محل میں ہیروں کا بنجارا
آگ کی کُرسی پر بیٹھا تھا

اک جادو گرنی وہاں دیکھی
اُس کی شکل سے ڈر لگتا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کالے مُنہ پر پیلا ٹیکا
انگارے کی طرح جلتا تھا

ایک رسیلے جُرم کا چہرہ
آگ کے سپنے سے نکلا تھا

پیاسی لال لہُو سی آنکھیں
رنگ لبوں کا زرد ہُوا تھا

بازو کھینچ کر تیرے بنے تھے
جسم کماں کی طرح ہلتا تھا

ہڈّی ہڈّی صاف عیاں تھی
پیٹ کمر سے آن مِلا تھا

وہم کی مکڑی نے چہرے پر
مایُوسی کا جال بُنا تھا

جلتی سانسوں کی گرمی سے
شیشۂ تن پگھلا جاتا تھا

جسم کی پگڈنڈی سے آگے
جُرم و سزا کا دوراہا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

چاند ابھی تھک کر سویا تھا
تاروں کا جنگل جلتا تھا

☆

چاند ابھی تھک کر سویا تھا
تاروں کا جنگل جلتا تھا

پیاسی کُونجوں کے جنگل میں
میں پانی پینے اُترا تھا

ہاتھ ابھی تک کانپ رہے ہیں
وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا

آنکھیں اب تک جھانک رہی ہیں
وہ پانی کِتنا گہرا تھا

جِسم ابھی تک ٹوٹ رہا ہے
وہ پانی تھا یا لوہا تھا

گہری گہری تیز آنکھوں سے
وہی پانی مجھے دیکھ رہا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کِتنا چُپ چُپ ، کِتنا گُم سُم
وہ پانی باتیں کرتا تھا

☆☆☆

نئے دیس کا رنگ نیا تھا
دھرتی سے آکاش مِلا تھا

☆

نئے دیس کا رنگ نیا تھا
دھرتی سے آکاش مِلا تھا

دُور کے دریاؤں کا سونا
ہرے سمندر میں گرتا تھا

چلتی ندیاں ، گارے نوکے
نوکوں میں اِک شہر بسا تھا

نوکے ہی میں رَین بسیرا
نوکے ہی میں دن کٹتا تھا

نوکا ہی بچوں کا جُھولا
نوکا ہی پیری کا عصا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مچھلی جال میں تڑپ رہی تھی
نوکا لہروں میں اُلجھا تھا

ہنستا پانی، روتا پانی
مُجھ کو آوازیں دیتا تھا

تیرے دھیان کی کشتی لے کر
میں نے دریا پار کِیا تھا

☆☆☆

چھوٹی رات، سفر لمبا تھا
میں اک بستی میں اُترا تھا

☆

چھوٹی رات، سفر لمبا تھا
میں اک بستی میں اُترا تھا

سُرما نسی کے گھاٹ پہ اُس دن
جاڑے کا پہلا میلا تھا

بارہ سکھیوں کا اک جُھرمٹ
سیج پہ چکّر کاٹ رہا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

نئی نکور کنواری کلیاں
کورا بدن کورا چولا تھا

دیکھ کے جوبن کی پُھلواری
چاند گگن پر شرماتا تھا

پیٹ کی ہری بھری کیاری میں
سُرخ مُکھی کا پھول کِھلا تھا

ماتھے پر سونے کا جھومر
چنگاری کی طرح اُڑتا تھا

بالی رادھا، بالا موہن
ایسا ناچ کہاں دیکھا تھا

کچھ یادیں، کچھ خوشبو لے کر
میں اُس بستی سے نکلا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

تھوڑی دیر کو جی بہلا تھا
پھر تری یاد نے گھیر لیا تھا

☆

تھوڑی دیر کو جی بہلا تھا
پھر تری یاد نے گھیر لیا تھا

یاد آئی وہ پہلی بارش
جب تجھے ایک نظر دیکھا تھا

ہرے گلاس میں چاند کے ٹکڑے
لال صراحی میں سونا تھا

چاند کے دل میں جلتا سُورج
پھول کے سینے میں کانٹا تھا

کاغذ کے دل میں چنگاری
خس کی زباں پر انگارہ تھا

دل کی صورت کا اک پتّا
تیری ہتھیلی پر رکھا تھا

شام تو جیسے خواب میں گزری
آدھی رات نشہ ٹُوٹا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

شہر سے دُور ہرے جنگل میں
بارش نے ہمیں گھیر لیا تھا

صبح ہوئی تو سب سے پہلے
میں نے تیرا مُنہ دیکھا تھا

دیر کے بعد مرے آنگن میں
سُرخ انار کا پُھول کِھلا تھا

دیر کے مُرجھائے پیڑوں کو
خوشبو نے آباد کِیا تھا

شام کی گہری اُونچائی سے
ہم نے دریا کو دیکھا تھا

یاد آئیں کچھ ایسی باتیں
میں جنہیں کب کا بُھول چکا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

میں ترے شہر سے پھر گزرا تھا
پچھلے سفر کا دھیان آیا تھا

☆

میں ترے شہر سے پھر گزرا تھا
پچھلے سفر کا دھیان آیا تھا

کتنی تیز اُداس ہوا تھی
دل کا چراغ بُجھا جاتا تھا

تیرے شہر کا اسٹیشن بھی
میرے دل کی طرح سُونا تھا

میری پیاسی تنہائی پر
آنکھوں کا دریا ہنستا تھا

ریل چلی تو ایک مُسافر
مرے سامنے آبیٹھا تھا

سچ مُچ تیرے جیسی آنکھیں
ویسا ہی ہنستا چہرہ تھا

چاندی کا وہی پُھول گلے میں
ماتھے پر وہی چاند کِھلا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جانے کون تھی اُس کی منزل
جانے کیوں تنہا تنہا تھا

کیسے کہوں رُوداد سفر کی
آگے موڑ جُدائی کا تھا

☆☆☆

میں اِس شہر میں کیوں آیا تھا
میرا کون یہاں رہتا تھا

☆

میں اِس شہر میں کیوں آیا تھا
میرا کون یہاں رہتا تھا

گونگے ٹیلو! کچھ تو بولو
کون اِس نگری کا راجا تھا

کِن لوگوں کے ہیں یہ ڈھانچے
کِن ماؤں نے اِن کو جَنا تھا

کِس دیوی کی ہے یہ مُورت
کون یہاں پُوجا کرتا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کِس دُنیا کی گوِتا ہے یہ
کِن ہاتھو نے اِسے لکھا تھا

کس گوری کے ہیں یہ کنگن
یہ کنٹھا کس نے پہنا تھا

کِن وقتوں کے ہیں یہ کھلونے
کون یہاں کھیلا کرتا تھا

بول مری مٹّی کی چڑیا
تُونے مجھ کو یاد کیا تھا

☆☆☆

پل پل کانٹا سا چُبھتا تھا
یہ مِلنا بھی کیا مِلنا تھا

☆

پل پل کانٹا سا چُبھتا تھا
یہ مِلنا بھی کیا مِلنا تھا

یہ کانٹے اور تیرا دامن
میں اپنا دُکھ بُھول گیا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کتنی باتیں کی تھیں لیکن
ایک بات سے جی ڈرتا تھا

تیرے ہاتھ کی چاہے تو پی تھی
دل کا رنج تو دل میں رہا تھا

کسی پُرانے وہم نے شاید
تجھ کو پھر بے چین کِیا تھا

میں بھی مسافر تجھ کو بھی جلدی
گاڑی کا بھی وقت ہُوا تھا

اِک اُجڑے سے اسٹیشن پر
تُو نے مُجھ کو چھوڑ دیا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

روتے روتے کون ہنسا تھا
بارش میں سُورج نکلا تھا

☆

روتے روتے کون ہنسا تھا
بارش میں سُورج نکلا تھا

چلتے ہوئے آندھی آئی تھی
رستے میں بادل برسا تھا

ہم جب قصبے میں اُترے تھے
سُورج کب کا ڈوب چکا تھا

کبھی کبھی بجلی ہنستی تھی
کہیں کہیں چھینٹا پڑتا تھا

تیرے ساتھ ترے ہمراہی
میرے ساتھ مرا رستہ تھا

رنج تو ہے لیکن یہ خوشی ہے
اب کے سفر ترے ساتھ کِیا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

پون ہری، جنگل بھی ہرا تھا
ہو جنگل کتنا گہرا تھا

☆

پون ہری، جنگل بھی ہرا تھا
ہو جنگل کتنا گہرا تھا

بوٹا بوٹا نُور کا زینہ
سایا سایا راہ نما تھا

کونپل کونپل نُور کی پُتلی
ریشہ ریشہ رس کا بھرا تھا

خوشوں کے اندر خوشے تھے
پُھول کے اندر پُھول کِھلا تھا

شاخیں تھیں یا محرابیں تھیں
پتّا پتّا دستِ دُعا تھا

گاتے پُھول، بُلاتی شاخیں
پھل میٹھے، جل بھی میٹھا تھا

جنّت تو دیکھی نہیں لیکن
جنّت کا نقشہ دیکھا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

☆☆☆

تنہائی کا دُکھ گہرا تھا
میں دریا دریا روتا تھا

☆

تنہائی کا دُکھ گہرا تھا
میں دریا دریا روتا تھا

ایک ہی لہر نہ سنبھلی ورنہ
میں طوفانوں سے کھیلا تھا

تنہائی کا تنہا سایا
دیر سے میرے ساتھ لگا تھا

چھوڑ گئے جب سارے ساتھی
تنہائی نے ساتھ دیا تھا

سُوکھ گئی جب سُکھ کی ڈالی
تنہائی کا پُھول کِھلا تھا

تنہائی میں یادِ خُدا تھی
تنہائی میں خوفِ خُدا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تنہائی محرابِ عبادت
تنہائی منبر کا دِیا تھا

تنہائی مرا پائے شکستہ
تنہائی مرا دستِ دُعا تھا

وہ جنّت مرے دل میں چُھپی تھی
میں جِسے باہر ڈھونڈ رہا تھا

تنہائی مرے دِل کی جنّت
میں تنہا ہوں، میں تنہا تھا

☆☆☆

تیرا قصور نہیں، میرا تھا
میں تُجھ کو اپنا سمجھا تھا

☆

تیرا قصور نہیں، میرا تھا
میں تُجھ کو اپنا سمجھا تھا

دیکھ کے تیرے بدلے تیور
میں تو اُسی دن رو بیٹھا تھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اب میں سمجھا ، اب یاد آیا
تُو اُس دن کیوں چُپ چُپ سا تھا

تجھ کو جانا ہی تھا لیکن
مِلے بغیر ہی کیا جانا تھا

اب تجھے کیا کیا یاد دِلاؤں
اب تو وہ سب کچھ ہی دھوکا تھا

وہی ہوئی ہے جو ہونی تھی
وہی مِلا ہے جو لِکّھا تھا

دِل کو یونہی سا رنج ہے ورنہ
تیرا میرا ساتھ ہی کیا تھا

کِس کِس بات کو روؤں ناصؔر
اپنا کہنا ہی اِتنا تھا

☆☆☆

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM